پروفیسر محمد حسن: ایک دیدہ ور نقّاد

محمد شاھد پٹھان

1625، ہادی منزل کمیلا اسٹریٹ، ایم۔ڈی۔روڈ، جے پور۔302004، موبائل: 9372843907

محمد حسن ہماری ادبی تاریخ میں ایک ترقی پسند ادیب اور روشن خیال نقاد کی حیثیت سے معروف ہیں، انھوں نے ایک طرف جہاں اپنے تخلیقی معمولات (شاعری، ڈرامہ، ناول) کے ذریعے اپنے جمہوری انسانی اور ترقی پسندانہ نظریات کی ترویج کی، وہیں سائنٹفک (کلیاتی) تنقید کا قابلِ قدر سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ وہ مشرقی ومغربی ادبیات وشعریات کے رمز شناس تھے۔ چنانچہ ایک ترقی پسند نقاد ہونے کے باوجود اپنے تنقیدی سفر میں وہ کبھی نظریاتی ادعائیت کے شکار نہیں ہوئے۔ انھوں نے اُردو اور ہندی ادب کے مطالعے میں جہاں مارکسی تصورات سے مصرف لیا، وہیں مشرقی شعریات کی اہمیت کا احساس بھی دلاتے رہے ہیں۔ قدیم وکلاسیکی ادب کی تفہیم میں انھوں نے مشرقی شعریات سے استفادہ کرتے ہوئے ادب فہمی کی قابلِ قدر مثال پیش کی ہے۔ محمد حسن صاحب کی تنقیدی تصانیف وتالیفات کافی ہیں، ان میں 'ادبی تنقید'، 'اُردو ادب میں رومانی تحریک'، 'جلال لکھنوی'، 'شعرِ نو'، 'دہلی میں اُردو شاعری کا فکر اور تہذیبی پس منظر'، 'جدید اُردو ادب'، 'شناسا چہرے'، 'عرضِ ہنر'، 'طرزِ خیال'، 'معاصر ادب کے پیش رو'، 'ادبیات شناسی'، 'ہیئتی تنقید'، 'اُردو ادب کی سماجیاتی تاریخ'، 'مارکسزم اور ادب'، 'غالب: ماضی، حال، مستقبل'، 'قدیم اُردو ادب کی تاریخ'، 'آخری سلام'، 'ہندی ادب کی تاریخ'، 'مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ' اور 'اودھ میں اُردو ادب کا تہذیبی اور فکری پس منظر' خاص کر لائقِ مطالعہ ہیں۔

محمد حسن اپنی ادبی وتصنیفی زندگی کے اوائلی دور ہی سے مارکسزم اور ترقی پسند تحریک سے متاثر ومنسلک رہے، مگر انہیں شروع ہی سے ترقی پسند ادبی نظریے کے بعض مجہول پہلوؤں سے نا اتفاقی رہی، اس سلسلے میں محمد حسن خود لکھتے ہیں:

> ''میں صرف اشتراکیت کو ایک عقیدہ یا فلسفے کی حیثیت سے اختیار کرچاہتا تھا، خود عملی سیاست میں کود پڑنے کا ارادہ نہ تھا، اس کے علاوہ مارکسزم کے ادبی نظریوں سے مجھے اب بھی اختلاف تھا میں اب ادب کو داخلی آواز جانتا تھا، ہنگامی ادب کا قائل تھا نہ پروپیگنڈے کا، البتہ فرقہ وارانہ اتحاد، سماجی انصاف اور اقتصادی مساوات، انسان دوستی اور آزاد خیالی کے لیے لڑنا اپنا فرض سمجھتا ہوں گویا میری سیاست اشتراکی تھی اور میرے ادبی نظریے غیر اشتراکی اس لیے جب (ماہنامہ) 'ادبی دنیا' میں میرے داخلی قسم کے مضامین شائع ہوئے تو میرا جی مرحوم نے لکھنؤ کے قیام کے دوران مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔''[1]

علمی وادبی سطح پر مارکسزم کے بیشتر مثبت ومفید مطلب تصورات کے اثبات وایجاب کے ساتھ ہی ساتھ محمد حسن کو مارکسی ادبی نظریے میں بعض فنی لوازمات کی کمی کا احساس رہا ہے، اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے محسوس کیا کہ انسان کو اقتصادی خوشحالی، مساوات اور سماجی انصاف سے کوئی محروم نہیں رکھ سکتا اور اس حد تک اشتراکیت وقت کی راگنی ہے، مگر اس میں انفرادی آزادی، فن اور فن کار کی آزادی، جمالیات کا احترام اور پورے نظام میں ایک باطنی معنویت کی کمی ہے جو کم سے کم بعض اقدار کو بنیادی، آفاقی اور ابدی قرار دے سکے۔''[2]

چنانچہ انھوں نے اپنے ادبی وانتقادی نقطۂ نظر میں انسان (اور سماج) کے حیاتیاتی اور مادی تقاضوں (مثلاً محبت، جنسی تسکین، امید ورجا، انصاف اور آزادی وغیرہ) کی مشارکت کو ناگزیر سمجھا ہے۔ اپنے ادبی نقطۂ نظر کی صراحت کرتے ہوئے محمد حسن نے لکھا ہے:

> ''ادب کا تعلق لازمی طور پر کسی نہ کسی حد تک فن کار کی شخصیت سے بھی ہوتا ہے اور ادبی سماجیات کے نقطۂ نظر سے ہر فن کار ایک ایسا سانس لیتا ہوا انسان ہے جو اپنے سماج کا حصہ ہے، اس کے کسی نہ کسی طبقے سے تعلق رہتا ہے وہ اپنے خاندان کا ایک فرد بھی ہے وہ کسی کا بیٹا بھی ہے کسی کا بھائی بھی ہے کسی کا محلے دار بھی، اس اعتبار سے اس کی سماجی سطح پر اس کے احساسات ہی پر نہیں اس کی پوری حسیت اور پوری آگاہیوں پر پڑتا ہے.....

اس نقطۂ نظر سے ہر فرد معاشرے کا وسیلۂ اظہار ہے اور ہر شاعر اور ادیب کی نجی حسیت وسیع تر اجتماعی حسیت کا حصہ بھی اور اس کی نمائندہ بھی اور انفرادی حسیت ہی نہیں افرادی زندگی اور انفرادی رویوں کا مطالعہ بھی پورے سماج کے مطالعے پر محیط ہوتا ہے اور یہی رویے کبھی ادب کی دنیا کی دھوپ چھاؤں میں ظاہر ہوتے ہیں کبھی دوسرے علوم وفنون کے رنگ وآہنگ میں کبھی سماج کی ساخت اور اس کی تبدیلیوں کی نشاندہی کرتے ہیں''۔[۳]

محمد حسن کے نزدیک تنقید کا دائرہ محض ادب پارے کی پرکھ تک ہی محدود نہیں بلکہ اس سے آگے ادب پارے کے تخلیقی محرکات اور اس دور کے پورے نظام اقدار کو محیط ہے اس طرح تنقید وسیع تر حسیت اور بصیرت کا حصہ بن جاتی ہے بقول محمد حسن:

''جس طرح تخلیق مختلف سماجی حقیقت اور انفرادی تجربات کے عمل اور ردعمل سے پیدا ہوئی ہے اسی طرح تنقید تخلیق اور اس سے پیدا ہونے والے تاثرات میں فکری معنویت اور وسیع بصیرت سے عبارت ہے، یعنی ادب سے پیدا ہونے والی بصیرت وسیع تر آگہی اور کائنات کے علم وعرفان کا حصہ بن کر سامنے آتی ہے۔''[۴]

محمد حسن نے ادب وشعر کی تفہیم وتنقید کے دوران ہمیشہ ذہنی کشادگی اور وسیع النظری سے مصرف لیا ہے، وہ مارکس نقاد ہونے کے باوصف کبھی ادعائیت اور انتہا پسندی کے شکار نہیں ہوئے، ''مارکسزم'' اور ''مارکسی تنقید'' کا تصور محمد حسن کے یہاں یہ ہے:

''ہر فن کار کے فن کی پرتوں میں اس کی انفرادیت بھی جلوہ گر ہوتی ہے اور اس کے دور کی اجتماعیت بھی اور ان کے علاوہ بھی اور بہت کچھ مارکسی تنقید اس کی دعوے دار نہیں کہ ہر دور کی صرف ایک ہی حقیقت ہوتی ہے بلکہ وہ ہر دور کی حقیقت کو مختلف ارتقا پذیر اور زوال آمادہ حقیقتوں سے متصادم مانتی ہے اس لیے اگر کوئی دو ہم عصر ادیب اپنے دور کی سچائیوں کو دو مختلف زاویوں سے دیکھتے اور اپناتے ہیں تو لازم ہے کہ اس میں بہت سی پیچیدگیوں کو دخل ہے، مارکسیت فرد کے داخلی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتی، ایک فرد کسی ایک طبقے سے متعلق ہوتے ہوئے بھی اپنے کو Declaress کرکے اپنے طبقے کے مفادات سے شعوری طور پر الگ اور کسی دوسرے طبقے سے نظریاتی طور پر اپنے کو وابستہ کرسکتا ہے۔''[۵]

محمد حسن نے اپنے اسی تصورِ نقد ونظر کی روشنی میں ترقی پسند شعرا اور ان کے بعد کی نسل کے ادبا وشعرا کا کھلے دل سے مطالعہ کیا ہے، اس فراخ دلانہ مطالعے کی مثال جدیدیت کے علم برداروں کے یہاں ناپید ہے، جدیدیت کے عروج کے دور میں محمد حسن نے ادبی مباحث کی افہام وتفہیم میں آل احمد سرور کی طرح سے انتہائی بالغ النظری اور ناقدانہ رسا کاری کا ثبوت فراہم کیا، اپنے رسالے 'عصری ادب' (۱۹۹۰ء تا ۱۹۷۰ء) کے اداریوں اور بعض مضامین کے ذریعے محمد حسن نے ترقی پسند اور جدید ادب کی اقدارِ مشترک کی جس طرح نشاندہی کی اور جدیدیت کو نئی ترقی پسندی سے تعبیر کرنے اور اسے تسلیم کرانے کی جو مثمر تدابیر کی ہیں وہ انہی کا حصہ ہے، اس سلسلے میں محمد حسن کے چند اہم مضامین مثلاً ''سچی جدیدیت، نئی ترقی پسندی'' (۱۹۶۸ء) ''نئی غزل کی آہنگ شناسی'' (مشمولہ 'عصری ادب': جولائی ۱۹۷۱ء) اور 'جدید اور ترقی پسند ادب کے مشترک اقدار' کا مطالعہ کافی ہوگا۔ اوّل الذکر مضمون میں مصنف نے جہاں سچی ترقی پسندی کی وضاحت کی ہے وہیں ''جدیدیت'' کے دوران بروئے کار آنے والی نئی شاعری کو نئی ترقی پسندی سے تعبیر کیا ہے، ترقی پسندی کے گلیارے سے جدیدیت کے صحن میں وارد ہونے والے ادبا میں وحید اختر اور عمیق حنفی بھی اس امر کا اثبات کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ جدیدیت پسند شاعری کے نفسِ مضمون اور پیرایۂ اظہار کی نشاندہی کرتے ہوئے حسن صاحب لکھتے ہیں:

''جدیدیت مختلف الخیال اور مختلف العقائد شعرا سے عبارت ہے اور کم سے کم ان میں بعض شعرا ایسے ضرور ہیں اور وہ اچھے جدید شاعر ہیں جو ترقی پسند نفسِ مضمون کو صرف نئے اور مختلف ڈکشن کے ساتھ نظم کرتے ہیں اور منفرد پیرایۂ اظہار اختیار کرتے ہیں، پیرایۂ اظہار کے اختلاف کو اندازِ نظر کا اختلاف قرار دینا صحیح نہیں اور اس اعتبار سے یہ شعرا بے شک نئی ترقی پسندی کا ہراوّل دستہ کہے جاسکتے ہیں۔''[۶]

محمد حسن زندگی کی طرح انسانی فکر واحساس اور سماجی اقدار وروایات کو بھی نامیاتی حقیقت سمجھتے ہیں جو کہ فطری طور پر تہذیبی ومعاشرتی ترفع و تسلسل کے ساتھ ارتقا پذیر ہوتی ہیں اور اسی طرح ادب وانتقادیات کے معیارات بھی اپنی جامعیت وتکمیلیت سے ہم کنار ہوتے جاتے ہیں چنانچہ پروفیسر شارب ردولوی نے لکھا ہے:

''ان (محمد حسن) کا نظریہ مارکسی نظریۂ ادب کا ایک تسلسل ہے ان کا سب سے بڑا Contribution یہ ہے کہ انھوں نے مارکسی تنقید کے امکانات کو وسعت دی اور اسے وقت کی تبدیلیوں سے ہم آہنگ کیا۔''[۷]

محمد حسن کی عملی تنقیدوں میں ان کا یہی ادیبانہ رنگ اور رویہ نمایاں ہے۔ اپنی تصنیف ''عرضِ ہنر'' (۱۹۷۷ء) کے 'دیباچہ' میں لکھتے ہیں:

''زیرِ نظر مضامین میں ان دونوں نقاطِ نظر (ہیئتی اور عمرانی) کے درمیان ایک توازن قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مصنف کا یہ خیال ہے کہ جن خصوصیات کو کسی فن پارے کی خالص اور جمالیات اقدار بتایا جاتا ہے وہ بھی دراصل تہذیبی اور طبقہ واری سیاق وسباق سے بے نیاز نہیں ہوتیں، جس طرح خیال ماحول سے پیدا ہوتا ہے اور ماحول طبقہ واری وفا داریوں میں منقسم ہے، اسی طرح اسلوب وآہنگ کے پیرائے اور اندازِ بیان کے رنگ اسی تہذیبی اور طبقہ واری سیاق وسباق سے اُبھرتے ہیں..... اس اعتبار سے ہیئتی تنقیدی عمرانی تنقید کا تتمہ ہوجاتی ہے اور عمرانی تنقید، ہیئتی تنقید کا ایک لازمی ضمیمہ، دونوں ایک دوسرے کے بغیر ادھوری ہیں، اسلوب وآہنگ کا مطالعہ شاعر کے مطالعے کا ناگزیر حصہ ہے اور شاعر کا مطالعہ اس کے دور کے پس منظر کے بغیر ممکن نہیں کہ خیال ہو یا جذبہ، دانش عصر ہو یا احساس وادراک یہ سب تہذیب ہی کے حصے ہیں اور تہذیب انسان کی آسودگی سے زندہ رہنے کے لیے فطرت کے خلاف کشاکش اور جدوجہد سے پیدا ہوتی ہے، ان مضامین میں فکر اور اسلوب کو اس وسیع پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔''[۸]

اوپر کی بحث سے محمد حسن کے تنقیدی نظریات پر روشنی پڑتی ہے انھوں نے اپنے انہیں سائنٹفک تصورات نقد کی روشنی میں اُردو کے رومانوی، ترقی پسند اور جدید ادب (نثری، شعری، تنقیدی) کا جائزہ لینے کی سعیِ مستحسن کی ہے، اپنے مطالعات میں محمد حسن بڑی حد تک معروضی رہنے کی کوشش کرتے ہیں، اگر چہ ایک مارکس نقاد ہونے کے باعث ترقی پسند ادب وشعر کے مطالعے میں ان کا رویہ قدرے ہمدردانہ ہوتا ہے تاہم وہ زیرِ مطالعہ ادب پارے کے مستحسن ومثبت پہلوؤں کے ساتھ ہی ساتھ اس کے معیوب ومجہول عنصر کی گرفت بھی ضروری سمجھتے ہیں اور یہ طریقِ کار ''ادبی تنقید'' (۱۹۵۴ء) اور اُردو میں رومانی تحریک (۱۹۵۵ء) سے لے کر ''آخری سلام'' میں شامل مطالعہ ادبا وشعرا کے مطالعات تک پھیلا ہوا ہے، یہاں محمد حسن کی عملی تنقیدوں سے کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں، جن سے ان کے طریقِ نقد کا اندازہ ہوسکے گا۔

پریم چند کی ادبی میراث اور اس کی معنویت ظاہر کرتے ہوئے محمد حسن لکھتے ہیں:

''پریم چند کی وراثت ان کی وہ عظیم محبت ہے جو انہیں ہمارے عوام سے ہے کسانوں اور عام انسانوں کے لیے ان کے دل میں درد ہے وہ ان کے قلم سے ٹپکا پڑتا ہے، انھوں نے عوام کے بارے میں رحم اور ہمدردی کے ساتھ گیت گانے کے بجائے ان سے اپنا رابطہ قائم کیا ہے ان کے درمیان رہ کر ان کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے، ان کے ماتھے کی شکن ان کے گیتوں کی لے ان کے کھیت اور کھلیانوں کی مہک اور ان کے کچھ جھونپڑوں کی باس بھی ان کی کہانیوں میں بسی ہوئی ہے۔''[۹]

چکبست کا شمار اُردو کے جواں مرگ شعرا میں ہوتا ہے، ان کی شاعری ہندو مذہب اور ہندوستانی قومی وتہذیبی اقدار ومظاہر کی ترجمان ہے۔ علاوہ ازیں ہم عصرانہ سیاسی اور سماجی کیفیات وخلفشار کی نقش گری بھی ان کی نظمیہ شاعری میں نمایاں ہے۔ لہٰذا محمد حسن چکبست کی شعری انفرادیت کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چکبست کی شاعری قومی احساس کی شاعری ہے، خاص طور پر ان کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے سیاسی اور ہنگامی موضوعات کو ادبی حسن عطا کیا، مرثیوں سے جو کام انھوں نے لیا ہے وہ حالی کے بعد کوئی نہ کرسکا تھا، چکبست نے ہماری شاعری کو انفرادی دکھ درد کی داخلی دنیا سے نکال کر ملکی اور قومی زندگی کی وسعت میں لا کھڑا کیا۔''[۱۰]

محمد حسن نے رومانی تحریک کا مطالعہ سنجیدگی، ژرف نگاہی اور بڑی حد تک دیانت داری کے ساتھ کیا ہے، اس تحریک کی عمل آوری کے محرکات سے لے کر اس دوران معرض وجود میں آنے والے شعری ونثری سرمایہ کے کیف وکم کا جس معروضی انداز میں جائزہ لیا ہے اس سے محمد حسن کی ناقدانہ کشادہ نظری کے ساتھ ہی شعری رمز آشنائی کا بھی کسی قدر پتہ چلتا ہے، اپنے مطالعے میں محمد حسن ناقدانہ طور پر دیانت داری کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، رومانوی تحریک کے مثبت اور مفید پہلوؤں کا اعتراف وہ کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''ٹیگور، اقبال اور ابوالکلام آزاد کی رومانوی انفرادیت نے اس عہد کو ایک نیا ذہن عطا کیا، ہمارے نوجوان جو انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب کی چمک دمک سے مسحور ہورہے تھے، یکا یک ایشیا کی عظمت اور اپنی شخصیت کی متاع کی طرف متوجہ ہوئے، انھوں نے مغرب سے تہذیب کی نئی شمعیں لیں، شخصیت کا نیا تصور لیا، جذبات اور تخیل کی نئے سانچے لیے اور ان کی روشنی میں ایشیا کی بازگشت کی کوشش کی، قیصر وکسریٰ، قیس ولیلیٰ، سلمیٰ امرائ القیس کا ایشیا، اس کوشش نے ان کے ذہنوں میں حسن کا

ایک نیا احساس بیدار کیا، شخصیت اور انفرادیت کا ایک نیا تصور آراستہ کیا اور جلد ہی ہمارا ادب سائنس اور حکمت سے نکل کر جاذبِ نظر شخصیت اور حسن پرست کرداروں کا ذریعۂ اظہار بن گیا۔''[11]

رومانویت کے مثبت پہلوؤں کی نشاندہی اور ان کے اعتراف کے ساتھ ہی ساتھ محمد حسن رومانوی ادبا و شعرا کے مجموعی کردار کو منفی تسلیم کرتے ہیں اور اس کے مجہول رخ کی کوتاہیاں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''بڑی حد تک ان کا کارنامہ منفی ہے، انھوں نے جو مثبت قدریں دریافت کی ہیں وہ مبہم اور سطحی ہیں، نسوانیت، ماورائیت اور موہوم رومان کی قوس قزح کی طرح حسین بھی ہیں اور غیر حقیقی اور دور افتادہ بھی، وہ جذبے کے جوش میں اتنے عرصے تک ستاروں کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے کہ ان کی نظریں ہماری زمین سے ہٹ گئیں جو خود ایک ستارہ ہے۔

رومانیت نے ادب کے رشتے جمالیات سے استوار کیے، لیکن وہ یہ بھول گئے کہ جمالیات اور فنی تقاضے بذاتِ خود اہم نہیں، وہ دراصل ایک مکمل اور بھرپور تاثر قائم کرنے کے ذرائع ہیں، فن پارے کی اہم ترین چیز، اس کی موہوم، لطافت نہیں، بلکہ وہ تاثر ہے جو وہ پڑھنے والے پر چھوڑتا ہے اور احساس خواہ کتنا ہی لطیف کیوں نہ ہو محض داخلی چیز ہے اور صرف اس کا حسن اس بات کی کافی دلیل نہیں ہے کہ اسے نظم میں ادا کیا جائے، جب تک کہ اس کا ایک سماجی مفہوم نہ ہو اور وہ کسی ایسی حقیقت کا اشاریہ نہ ہو جو شاعر یا اس کا احساس کرنے والے کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی کوئی اہمیت رکھتی ہو، رومانوی ادیب کے نزدیک احساس کی لطافت پہلی اور آخری دلیل ہے وہ استعاروں اور تشبیہوں میں باتیں کرتا ہے.....اس طرح ادب انفرادی داخلیت کی تنگنائے میں اسیر ہو جاتا ہے، رومانوی، ادب اور سماج کو دو مختلف دنیاؤں کی چیزیں سمجھنے لگتا ہے اور آہستہ آہستہ سماجی حقائق سے اس کا تعلق یا تو برائے نام رہ جاتا ہے۔''[12]

رومانویت کے اسی تصور کے پیش نظر محمد حسن نے رومانوی، شاعروں، ادیبوں، افسانہ نگاروں اور بعض نقادوں کے رشحات قلم پر اظہار خیال کیا ہے مجنوں گورکھپوری کی دو راول کی رومانوی تنقید کے سلسلے میں محمد حسن لکھتے ہیں:

''مجنوں نے رومانویت کو فلسفے سے زیادہ ایک جذباتی آہنگ کے طور پر اختیار کیا، مجنوں گورکھپوری کی تنقیدوں میں فکری تصوریت سے زیادہ جذباتیت ملتی ہے''۔[13]

محمد حسن صاحب نے مجنوں کے بارے میں یہ رائے ان کی مختصر سی کتاب ''تنقیدی حاشیے'' کے متعلق ظاہر کی ہے، ان کی تصنیف ''ادب اور زندگی'' پر اس رائے کا انطباق نہیں ہوسکتا ہے کہ اس میں وہ ایک ترقی پسند نقاد کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔

اُردو شعرا میں مجاز، محمد حسن صاحب کے دوستوں میں شامل رہے ہیں، ان کی شخصیت اور شاعری کے محمد حسن شروع ہی سے قدرداں رہے ہیں، اپنی آپ بیتی میں انھوں نے بڑی محبت کے ساتھ مجاز کا تذکرہ کیا اور ان پر ایک سوانحی ناول ''غمِ دِل وحشتِ دل'' بھی لکھا ہے، محمد حسن نے اپنے مضمون ''شاعرِ محفلِ وفا'' میں مجاز کی شخصیت و شاعری کا معقول تجزیہ کیا ہے۔ مجاز کی رومانویت اور اجتماعیت پر انھوں انتقادی زاویے سے بحث کی ہے لکھتے ہیں:

''مجاز اپنے ہم عصروں میں اسی نوعیت کے شاعر ہیں جس کی زندگی اجتماعی راگ و رنگ کی زمین ہی سے پیوند رکھتی ہے۔ اس کی مسرت کا پودا اسی مٹی اور کھلی ہوا، روشنی اور رنگینی میں سانس لیتا اور پنپتا ہے۔''[14]

''رومانویت کو وسیع تر معنویت اور حقیقت نگاری کا آہنگ بخشنے میں مجاز کی شاعری کو امتیازی حیثیت حاصل ہے اور روانی، عجمی لے اور داخلی اور آفاقی حسیت کی پرتوں سے پھوٹ پڑنے والی شاعری اجتماعی اور مجلسی آہنگ سے تربیت پانے والی شخصیت اور شاعری دونوں اُردو شاعری میں لطافتِ احساس اور رعنائیِ اظہار کے ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہے۔''[15]

جذبی کی شاعری، عام ترقی پسند شعرا میں امتیازی وصف رکھتی ہے ان کے شعری اظہارات (غزل، نظم) میں جو توازن، متانت اور نرم آہنگی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، محمد حسن جذبی کی شاعری کے اس کیف و کمال کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جذبی کی شاعری کا ایک خاصہ یہ بھی رہا ہے کہ وہ تقاضے یا رواج کے مطابق شاعری نہیں کرتے، بلکہ احساس کو اپنا رہنما بناتے ہیں اور جس احساس کو وہ سچا اور کھرا جانتے ہیں اس کے لیے مناسب اظہار پا لیتے ہیں اور وہ شعر کے سانچے میں ادا ہو جاتا ہے اور اسی لیے وہ بہت کم گو شاعر ہیں۔''[16]

''جذبی کا آرٹ ضبط و توازن کا آرٹ ہے وہ ارتکاز کے قائل ہیں اور اسی ارتکاز کو انھوں نے فن کی تہذیب سے جلا بخشی ہے، اسے حاصل

کرنے کے لیے تجربات اور مشاہدات کو کسی مشترک تصور کے نقطے پر جمع کرنا، شخصیت کا پوری طرح حصہ بنانا، بھوگنا اور بھگتنا اور پھر اسے اس طرح زیست میں سمولینا کہ وہ طرزِ احساس کی یہی وجد آفریں غنائیت ان کا سرمایۂ امتیاز ہے، جس میں الفاظ کے محتاط انتخاب اور ان کے فن کارانہ دردبست کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔''[17]

کیفی اعظمی کے رمزی اور سادہ اسلوب میں بیان کردہ حیات و کائنات اور سماجیات و سیاسیات کے مضامین و مظاہر کی شعری تقلیب کاری کے ضمن میں محمد حسن لکھتے ہیں:

''سیاسی شاعری محض ہنگامی شاعری نہیں ہوتی سیاست کے وسیع تر اور زیادہ جامع شعور سے پھوٹتی ہے، اس کے چند اچھے نمونے کیفی اعظمی کے ہاں ملیں گے..... ترقی پسند شاعری کا راستہ لازمی طور پر رومانوی بانکپن سے ہوتا ہوا انقلابی حسیت تک جاتا ہے، لیکن انقلابی حسیت بغیر انقلابی صورتِ حال کے کن راہوں سے گزرتی ہے اور کیسے کیسے موڑ اختیار کرتی ہے کن موضوعات اور علامتوں سے دو چار ہوتی ہے اور اظہار و بیان کے کن پیرایوں سے گزرتی ہے، اس کا اندازہ کیفی کی شاعری میں نمایاں طور پر ہوجاتا ہے، انھوں نے ہمت شکن حالات میں بھی سپر نہیں ڈالی ہے اور اس لیے ان کی شاعری نڈھال نہیں، حوصلے سے محروم نہیں، ان کی آنکھیں دور آسمان پر چمکنے والے ستارے سے نہیں ہٹی ہیں اور یہی ستارہ ان کی شاعری میں نورنگینی اور تازگی بکھیرتا رہا ہے۔''[18]

دوسرے ترقی پسند نقادوں مثلاً احتشام اور ممتاز حسین کی مانند محمد حسن صاحب نے بھی غالبؔ کا سائنٹفک مطالعہ کیا ہے، ''عرض ہنر'' (۱۹۷۷ء) میں تنہا غالبؔ پر آٹھ مضامین شامل تھے، جبکہ انیسؔ پر دو اور اقبالؔ پر ایک ہی مضمون شاملِ کتاب تھا، اس سے غالبؔ کے تئیں مصنف کی ذہنی رغبتوں کا اندازہ ہوتا ہے، بعد کو ان کی ''غالب: ماضی، حال، مستقبل'' (۲۰۰۵ء) نامی کتاب بھی شائع ہوئی ہے۔ محمد حسن یوں تو اقبالؔ کے فلسفیانہ شعری اقدار و آہنگ کے بھی قائل ہیں کہ انھوں نے ''شاعری کو نئی توانائی سے مالا مال کردیا اور یہ توانائی انسان کے اس عظیم الشان تصور سے آئی جو انہیں فلسفے سے ملا اور جسے انھوں نے جہد حیات کی آمیزش سے زیادہ عملی اور زیادہ حوصلہ افزا بنادیا'' بایں ہمہ محمد حسن کو یہ احساس بھی ہے:

''مگر اقبالؔ فوق البشر کے شاعر ہیں بشر کے شاعر نہیں ان کے یہاں پیغمبروں کی تصویریں ہیں انسان کی نہیں ان کی نظموں میں تصورات کے ڈھانچے ہیں دل کی دھڑکنیں، بڑی حد تک فراموش کر بیٹھتے ہیں اور اسی لیے ان کی شاعری حوصلہ تو دیتی ہے مگر دل کے نازک تاروں کو بہت کم چھوتی ہے، مکمل مساوات سکھانے والے مذہب کے علم بردار ہوتے ہوئے وہ بشر اور فوق البشر کے درجے قائم کرکے ''اسلامی برہمنیت'' کے موجد ہونے کے الزام سے مکمل طور پر بری نہیں کئے جاسکتے۔''[19]

لیکن غالبؔ کے یہاں فاضل مصنف کو وہ ذہنی، جذباتی اور فکری کشمکش ملتی ہے جو گوشت پوست کے انسان یعنی عام آدمی یا انسان کے حواس و افکار سے زیادہ موانست و قرابت رکھتی ہے، تعمیم (Generalisation) ''کلامِ غالبؔ کا ایسا وصف ہے جو اُنھیں ہر نسل اور ہر دور کے قاری کو متاثر کرتا رہا ہے، لہٰذا محمد حسن لکھتے ہیں:

''غالبؔ کی سب سے بڑی قوت ان کی تعمیم ہے، غزل ہے بھی تعمیم کی زبان اور غالبؔ غزل کے چھوٹے سے سانچے اور محدود لفظیات کو اس انداز سے استعمال کرتے ہیں کہ اس میں نئی جہات پیدا ہوجاتی ہیں، ایک ہی شعر میں کئی مطلب نکل آتے ہیں اور ہر طرف امکانات کی نئی راہیں کھل جاتی ہیں، حالیؔ، غالبؔ کے پہلے نقاد ہیں جس نے اس تہہ داری کے رمز کو پہچانا، اس کے بعد سے آج تک غالبؔ کے سبھی قدرداں اس تہہ داری اور تعمیم کے ادا شناس رہے ہیں، تعمیم نے اس کے کلام کو اپنے دور کی مُہر لگنے سے بچالیا بلکہ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ غالبؔ کے ہاں وہ موضوعات بہت کمزور ہیں جو ان کے دور کے واقعات سے متعلق ہیں، وہ واقعات کو بھی تعمیم بخش دیتے ہیں اور اس وجہ سے وہ واقعات کے نہیں کیفیات کے شاعر ہیں۔''[20]

اسی طرح نئی نسل سے غالبؔ کی مقاربت و مشارکت کے پہلو کی نشاندہی کرتے ہوئے محمد حسن رقم طراز ہیں:

''نئی نسل اور غالبؔ کے درمیان بہت سی کیفیات مشترک ہیں، لہٰذا وہ غالبؔ کی تعمیم کو اپنے معنی دے لیتی ہے اور یہ محسوس کرتی ہے کہ غالب ان کے تجربے میں شریک ہے، سب سے زیادہ اہم کیفیت وہ ہے جسے بیک وقت نشاطِ زیست اور آشوبِ آگہی سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ نئی نسل آرزومندی سے تائب نہیں ہے اور یہ اس کربِ مسلسل کا سبب بھی ہے، ہر لمحے وہ سلیقے سے زندگی کرنے اور زندگی کی ساری خوبصورتی اور لذت کو سمیٹنے کے لیے بے چین ہے، اس کی آرزومندی بے پایاں ہے اس لیے جب خواب چکنا چور ہوتے ہیں اور حقیقتیں خوبصورتی اور لذت

سمیٹ لینے میں حارج ہوتی ہیں تو دل شکستگی اور کرب جنم لیتے ہیں اور نشاط اور غم کی آمیزش سے ایک عجیب آمیزہ تیار ہوتا ہے نشاط زیست سے دامن نہ چھڑا سکنے والا نہ صوفی ہوسکتا ہے نہ قنوطی وہ بار ہا ٹھوکر کھا کر آرزو کرتا ہے اور امید کا سہارا لیتا ہے، اتنی بار کہ اس کو اسی عمل میں لطف آنے لگتا ہے..... زندگی کو پوری اکائی کی طرح قبول کرتے ہیں اس کی مستی اور زہر دونوں کو اپناتے ہیں اور دنیا داروں کی طرح اپناتے ہیں، ان کے چہرے پر نہ صوفی کا نقاب ہے نہ فلسفی کا وہ تو ایک کھلا ڈلا وجود جو ہماری دنیا میں گھل مل جاتا ہے، عام انسانوں کی طرح ہنستا بولتا ہوا زندگی کے رنگ و آہنگ سے آنکھیں روشن اور سینہ فگار کرتا ہوا وجود۔''[۲۱]

غرض کہ 'عرضِ ہنر' میں شامل (غالبؔ، انیسؔ، اقبالؔ اور ہندوستانی ادب، پر مشتمل) ۱۴/ مضامین میں سے زیادہ تر مطالعوں میں محمد حسن کا ایک وسیع اور جامع طریق نقد بروئے کار آیا ہے اور مصنف کا یہ دعویٰ کسی قدر مبنی بر حقیقت معلوم ہوتا ہے کہ: '' یہ مضامین ہیئتی اور عمرانی تنقید کا ایک نقطۂ اتصال ضرور فراہم کرتے ہیں۔''[۲۲]

پروفیسر محمد حسن واقعتاً اُردو کے بڑے ترقی پسند نقاد ہیں۔ انھوں نے اپنے دور کی روایتی مارکسزم اور روایتی ترقی پسندی کے دائرۂ کار میں اضافہ کرتے ہوئے سچی سائنٹفک اور کلیاتی تنقید کے نمونے پیش کئے۔ انھوں نے 'جدیدیت' کے دوران ظہور پذیر شعری میلان کی تحقیر نہیں کی بلکہ اسے نئی ترقی پسندی سے تعبیر کرتے ہوئے یہ نکتہ سمجھانے کی سعی کی کہ ادب و شعر میں رونما ہونے والی تبدیلیاں انسانی سماج و تاریخ کا حصہ ہیں اور تبدیلی زندگی کی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ اپنے زاویۂ نگاہ سے ترقی پسندی کی وضاحت کرتے ہوئے محمد حسن نے صاف لکھا ہے: '' یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ تحرک و تبدل کے اس اصول کے مطابق تفہیم ادب کے تنقیدی معیار بھی برابر بدلتے رہتے ہیں اور اسی کے ساتھ تخلیق کے اصول اور ضابطے بھی۔ محمد حسن لکھتے ہیں کہ '' ادبی تنقید کا کوئی رویہ بھی مکمل اور جامع نہیں کہا جاسکتا''۔ تاہم ادبی سماجیات یعنی ادب کو سماج کے رشتوں سے اور سماج کو ادب کے وسیلے سے پہچاننے کی کوشش، کو وہ ایک معتبر و مؤثر طریقِ نقد تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''کسی فن پارے کی قدر و قیمت کی مختلف جہات کو سمیٹنے کے سلسلے میں ادبی سماجیات کا بھی ایک اہم منصب ہے اور اسے نظر انداز کرنا ادب کی تفہیم اور اس کی سماجی معنویت کے ایک دلچسپ اور بصیرت آموز پہلو سے محرومی کے مترادف ہے۔ ادبی سماجیات کے علم کے بغیر ادب کی تکمیل کا احساس و ادراک ممکن نہیں یا کم سے کم اس کے ایک اہم پہلو سے محرومی لازمی ہوگی۔''[۲۳]

حوالہ جات:

۱۔ محمد حسن: افکار و اسالیب، ص:۳۱
۲۔ محمد حسن: افکار و اسالیب، ص:۳۷
۳۔ مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ ص:۳۸۹، اشاعت ۲۰۰۰ء ناشر: ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی
۴۔ ادبیات شناسی، ص:۱۷۱
۵۔ مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ، ص:۳۱۴
۶۔ جدید اُردو ادب، ص:۲۱۳، اشاعت ۱۹۷۵ء، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی
۷۔ محمد حسن کی نظری و عملی تنقید، مطبوعہ 'آج کل' ص:۱۱، بابت، جولائی ۲۰۱۰ء دہلی
۸۔ عرضِ ہنر، ص:۹۔۸، محمد حسن، اشاعت ۱۹۷۷ء، نصرت پبلشرز، لکھنؤ
۹۔ ادبی تنقید، ص:۱۴۷، اشاعت ۱۹۵۴ء ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ
۱۰۔ شعر نو، ص:۱۱۸، اشاعت، ۱۹۶۱ء، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ
۱۱۔ اُردو ادب میں رومانوی تحریک، ص:۲۵، اشاعت ۱۹۹۹ء عاکف بک ڈپو، دہلی
۱۲۔ اُردو ادب میں رومانوی تحریک، ص:۴۷
۱۳۔ اُردو ادب میں رومانی تحریک، ص:۷۹
۱۴ معاصر ادب کے پیش رو، ص:۵۶
۱۵۔ معاصر ادب کے پیش رو، ص:۵۹
۱۶۔ معاصر ادب کے پیش رو، ص:۶۳
۱۷۔ معاصر ادب کے پیش رو، ص:۶۴
۱۸۔ معاصر ادب کے پیش رو، ص:۹۹
۱۹۔ معاصر ادب کے پیش رو، ص:۱۰-۹، اشاعت ۱۹۸۲ء، ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی
۲۰۔ 'عرضِ ہنر' ص:۸۴، اشاعت: ۱۹۷۷ء، نصرت پبلشرز لکھنؤ
۲۱۔ عرض ہنر، ص:۸۵
۲۲۔ عرضِ ہنر، ص:۸
۲۳۔ اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ، ص:۱۴، اشاعت ۱۹۹۸ء، ناشر قومی کونسل، نئی دہلی

○○